فیہا کتب قیمۃ

مقالاتِ شروانی

یعنے

مضامین نثر کا مجموعہ

جو

ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

نے

سینتالیس سال (۱۸۸۹ء تا جون ۱۹۳۶ء) کے عرصہ میں لکھے اور اکثر اخباروں اور رسالوں و رکتابوں
میں شائع ہوئے اور بعض اب صرف اس مجموعہ کے ذریعے شائع ہو رہے ہیں

زیر ادارۃ و نگرانی

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

(مالک منیجر شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ چھپے)

مقالاتِ شروانی

فہرستِ مضامین

نوٹ: (۱) اس فہرست کی ترتیب یقیناً نامانوس نظر آئے گی۔ وجہ یہ کہ مضامین کی ترتیب بلحاظ زمانہ تحریر رکھی گئی ہے۔ مگر چند در چند ناگزیر وجوہ سے کتابت میں یہ اسلوب قائم نہ رہ سکا۔ لہٰذا یہ نقص بذریعہ موجودہ ترتیب فہرست کے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) جن مضامین پر ستارہ (٭) کا نشان ہے وہ غیر شائع شدہ ہیں۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی
مرتب و طابع و ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقالاتِ شروانی

پیش لفظ

حامداً و مصلیاً

ایام طالب العلمی میں کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی۔ اُس میں علامہ کا یہ قول بلاغت کے بیان میں پڑھا۔

"کمالِ بلاغت اس میں ہی کہ واقعات کے بیان میں جوہر بلاغت نمایاں ہوں، اس لئے کہ واقعہ نگاری میں بیان واقعات کے تابع ہی لہذا میدان بیان تنگ ہی۔ افسانہ وخیالی مضامین کی نگارش میں بیان آزاد ہے اور فسانہ و مضامین تابع لہذا میدان وسیع۔"

اس قول کو دل نے لیا۔ لکھنے کا شوق واقعہ نگاری میں پورا ہوا۔ افسانہ وخیالی مضامین لکھنے سے طبیعت کنارہ کش رہی۔

خودستائی معیوب ہی تاہم بعض نکتہ سنج ارباب ذوق نے جو خیال میری تحریروں کی بابتہ ظاہر فرمایا ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ میں بحمد للہ کامیاب ہوا۔

اب نظر کو بڑھائیے۔ مقالات پڑھئے خود فیصلہ کیجئے۔

حبیب منزل علی گڑھ: ۱۷ شعبان المعظم ۱۳۶۵ھ
(۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء)

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی
(نواب صدر یار جنگ)

عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا بہت کم تھی۔ آخر آخر میں اُس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ و ۲۷ جنوری ۱۹۱۵ء)

علی گڑھ کالج میں تکبیر و تہلیل

ڈیڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ۱۰ فروری سنہ حال کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں جو مضمون بعنوان "علی گڑھ کالج میں تہلیل و تکبیر" رسالہ خطیب سے نقل کیا گیا ہے اُس میں بعض بیان ایسے ہیں جو واقعات کے صریح خلاف ہیں۔ اور چونکہ وہ مضمون آپ کے اخبار میں نقل ہوا ہے اس لئے اگر اُن کی تصحیح نہ کی جائے تو غلطیاں زیادہ سنگین ہو جائیں گی۔ اس لئے مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں منصلہ ذیل سطور کے شائع کرنے کی درخواست آپ سے کروں۔

(۱) جلالت مآب امیر کابل نے جو امتحان دینیات رونق افروزی کالج کے وقت لیا تھا وہ قرأت کا نہ تھا بلکہ عقائد و فقہ کا تھا۔ جس تحقیق کے ساتھ یہ امتحان لیا گیا اُس سے وہ اصحاب واقف ہیں جو طلبہ امتحان میں شریک تھے۔ منجملہ سوالات ایک یہ سوال بھی تھا کہ "دم مسفوح" کس کو کہتے ہیں؟ اسی امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے ہز مجسٹی اسٹریچی ہال میں وقت مقررہ سے بہت بعد تشریف لیجا سکے تھے۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ پہلے سے طلبار انتخاب کرکے پیش نہیں کئے گئے تھے بلکہ فی الوقت امیر صاحب نے قصد امتحان ظاہر فرمایا اور اسی وقت جس قدر طلبار پیش نظر تھے وہ حاضر کردیے گئے۔ اور اُن ہی کا امتحان مذکورہ بالا مضامین میں ہوا۔ آخر امتحان میں جب ہز مجسٹی نے قرآن کی تعلیم کی بابت سوال کیا تو چند طلبار قرآن سنانے پر آمادہ ہوگئے۔ اُن میں سے علی الدین کو طلب فرمایا۔ یہ بیشک حسنِ اتفاق تھا کہ وہ فن تجوید سے واقف تھے اور اُن کی قرأت کا یہ اثر ہوا کہ امیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بہرحال اصلی امتحان فقہ و عقائد کے مسائل کا تھا جس کی نسبت پوری تحقیق کے بعد امیر صاحب نے اپنا اطمینان الفاظ ذیل میں ظاہر فرمایا تھا:۔

"من بعضے خود و زبان خود از شاگردان کالج موصوف امتحان بعض عقائد ضروری اسلامی و مسائل نماز و روزہ گرفتم تمام سوالہائے مرا بطریق عقائد اہل اسلام جواب گفتند۔"

اس امتحان کے بعد جو اندازہ دینیات کالج کا امیر صاحب نے فرمایا وہ صریح راست تھا نہ "صریح غلط" اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو ترقی دینیات آج خدا کے فضل سے کالج میں نمایاں ہے اس کی بنیاد نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے عہد میں پڑ چکی تھی اور جناب ممدوح دل سے ترقی دینیات کے جویا تھے۔

(۲) نواب وقار الملک بہادر کے زمانہ میں دینیات نے بہت زیادہ ترقی کی۔ پروفیسر دینیات کا عہدہ قائم ہو کر مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ درس قرآن و تفسیر کی جماعت قائم ہوئی۔ اس کا ایک دور ختم بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی علمائے کرام مدعو ہوئے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب، مولانا ولایت حسین صاحب الہ آبادی اور دیگر بزرگوں سے درخواست قدوم کی گئی تھی چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی تشریف لائے اور چند گھنٹے امتحان لیا۔ جو تحریر بعد امتحان میرے نام بھیجی تھی اس سے واضح ہوتا تھا کہ نتیجۂ امتحان سے ممدوح کو حیرت انگیز اطمینان تھا۔

(۳) صیغۂ تجوید کی بنیاد نواب اسحٰق خاں صاحب بہادر کے عہد میں قائم ہوئی ہے۔ تکمیل مسجد کا سہرا کارکنان قضا و قدر نے نواب صاحب ممدوح کے واسطے محفوظ رکھا تھا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء و اللہ ذو الفضل العظیم۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳ر مارچ ۱۹۱۵ء)

کا عنوان ہے: "قسم دوم در توحید رب العالمین جل جلالہ"۔ آخری حصہ کا عنوان ہے: قسم دہم مثنویات۔ اول کنوز الرموز جو سیر العباد الی المعاد۔ دو مراتب حال انسانی۔ آخری دو مثنویاں مجموعۂ ہذا میں نہیں ہیں۔ صرف کنوز الرموز ہے۔

چوتھا قلمی نسخہ مکاتیب سنائی کا ہے۔ تقطیع چھوٹی۔ خوشخط نسخ۔ ۱۲ خط ہیں۔ ایک خواجہ احمد بن مسعود کے نام جن کی فرمائش سے حکیم سنائی نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ ایک خط خواجہ قوام الدین وزیر عراق کے نام ہے۔ ایک حکیم عمر خیام کے نام باقی علیٰ ہذا القیاس۔ حکیم عمر خیام کے القاب میں "فرید الزمانی فرید الدہر" لکھا ہے۔ درمیان خطوں میں ایک جگہ "پیشوائے حکیماں" کے لفظ سے خطاب کیا ہے۔ مکاتیب کی تحریر کا سنہ اور کاتب کا نام درج نہیں۔ خط اور کاغذ کے انداز سے نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

المبینؐ

(ریویو)

تقریباً چالیس برس کا زمانہ گزرتا ہے علامہ شبلی مرحوم کی تحریک سے میں نے جرجی زیدان کا رسالہ الہلال خریدنا اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ مراسلت بھی ہوئی۔ اُس زمانہ میں اعتدال اور وسعتِ مشرب کے لحاظ سے الہلال کے مضامین قابل پسند ہوتے تھے۔ علامہ مرحوم نے بھی اُس کی تعریف ایک بار سے زیادہ فرمائی تھی۔ رفتہ رفتہ طبیعت کا اصلی رنگ نمایاں ہوتا گیا۔ اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ "مدیر الہلال" کو عربوں سے نفرت نہیں، تو کاوش ضرور ہے۔ اسی لئے بنی اُمیہ کی خلافت کی تنقیص اور خلافتِ عباسیہ کی توصیف اُس کا شعار تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اُسی عرصہ میں ایک سے زیادہ ناول اُس کے شائع ہوئے۔ اُن میں بھی متمدن پیرایہ میں عرب و اسلام کی منقصت پیش نظر رہتی تھی۔ لیکن یہ تدلیس اس قدر دل فریب ہوتی تھی کہ خود مسلمان اُس کے احساس سے عاری رہتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک سے زیادہ کا ترجمہ خود مسلمانوں نے کیا۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکا۔ بالآخر علامہ مرحوم نے اس کو ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو خصوصاً اور اہل علم کو عموماً جرجی زیدان کی تدلیس سے بچائیں۔ عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا اور منتقدانہ انداز میں جرجی زیدان کی غلطیاں اور تدلیسات کو واضح کیا۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو کر شائع ہوا تو شیخ رشید رضا مدیر المنار نے بہت

ؐ ملنے کا پتہ: مطبع شہروانی، علی گڑھ۔

گرم جوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ "خود وہ اس ضرورت کو محسوس کر رہے تھے لیکن جرجی زیدان کی تدلیسات اور فریب کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کو قابو میں لاکر تردید کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ مولانا شبلی کی قوتِ دماغی قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے قابو پاکر یہ علمی خدمت ادا کی اور اہلِ علم کو دھوکا کھانے سے بچا لیا"۔ یہ تو پارینہ داستان تھی۔ البیین کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ جہاں الہلال کے ذریعہ سے عربی تمدن، تاریخ اور دین کی بیخ کنی کی جاتی تھی وہاں فلسفۃ اللغۃ العربیہ عربی زبان کی عظمت کو مٹانے کی کوشش ہے۔ بہرحال عربوں سے وحشت کا یہ بھی ایک انداز ہے۔ مباحث کا جو خلاصہ البیین میں ہے اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تمدن کے مقبول و محبوب اندازو طرز استدلال سے فلسفۃ اللغۃ العربیہ کے مؤلف نے بھی فیض پایا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ "ضرورت کے وقت جزئی کو کلی کر دینا۔ خاص کو عام بنا دینا۔ اپنے قیاس کو واقعہ کا جزو یا واقعات کی کڑی قرار دیکر حقائق کو اُن کی اصلیت سے پھیرنا۔ اُن سے اپنے موافق نتیجہ نکال لینا"۔ محولہ بالا جو خدمتِ علمی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے ادا فرمائی تھی اُس کی تکمیل گویا البیین کے مؤلف مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے قلم سے ہوئی اور ممدوح نے خصوصاً اہلِ لُغت پر احسان فرمایا ہے کہ اُن کو ایک سخت مُہلک مغالطہ سے بچا لیا ہے۔ البیین میں صرف یہی نہیں ہے کہ جرجی زیدان کی لغزشوں اور غلط کاریوں کی تصحیح و تسدید فرمائی گئی ہے بلکہ عربی زبان کی خصوصیات اس کاوش اور تحقیق سے قلمبند فرمائی ہیں کہ بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا نیا فن مُدوّن فرما دیا ہے جس کے دھندلے سے متفرق آثار اگلوں کی تصانیف میں نظر آجاتے تھے۔

البیین کے سات باب ہیں۔ اُن میں حروف کی بحث سے لیکر کمالِ گویائی تک تمام مدارج اور منازل میں عربی زبان کی فضیلت و عظمت اس خوبی سے بیان فرمائی ہے کہ پڑھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ یہ نہ خیال فرمایا جائے کہ فضائل کا قصیدہ پڑھا گیا ہے یا خطبہ دیا گیا ہے۔ نہیں۔ علمِ اصولِ لغت، فلسفہ اور منطق، تعمق نظر اور قوتِ بحث سے حقائق کو واضح اور منکشف فرمایا ہے۔ درس نظامی کی استعداد آفرینی علمی حلقوں میں مُسلّم ہے۔ مگر البیین کو پڑھکر واضح ہوا کہ درس مذکور نہ صرف استعداد آفریں تھا بلکہ مجتہدانہ قوت بھی پیدا کر سکتا تھا۔ البیین میں مؤلفِ محقق کے قلم نے اُن دشوار گزار میدانوں کو فاتحانہ طے کیا ہے

جن کا نشان بھی اگلی کتابوں میں نہیں - اور اگر یہ توجیہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا مجمل اور مبہم سا نفظ "قطن" کی بابت (جہاں جرجی زیدان نے قلم رکھ دیا تھا) تو ایسا دقیق نکتہ زیب قلم ہوا ہے کہ جس کو پڑھ کر قلب پر وہی کیفیت طاری ہو جو برجستہ شعر کے سننے سے طاری ہوتی ہے - عربی زبان سے بنگری ہی تھوڑا بہت تعلق بصف صدی سے ہے - مگر جو مضامین المبین میں پڑھے کبھی اس کا واہمہ بھی نہ ہوا تھا کہ زبان عربی ان حقائق و معارف سے مالامال ہے - بیان اتنا مدلل اور صاف ہے کہ ذہن بے تکلف اُس کو قبول کرتا ہے - ہاں عناد اور ضد کا علاج نہیں - دقیق علمی مضامین کو اس قدر واضح بیان کر دینا مؤلف المبین کا حصہ تھا۔

مصنفِ علّام نے المبین کو سات بابوں پر تقسیم کیا ہے - بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک زبان کی حقیقت واضح کرنے کے واسطے جتنے پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے وہ تمام پہلو ان ابواب میں زیر بحث آ گئے ہیں - حرف سے لیکر معانی کے فلسفہ تک کلام کے تمام مراتب پر بحث کی گئی ہے - بحث میں ایک حکیم کی دقت نظر، ایک ادیب کے ذوق، ایک لغوی کی ہمہ گیری سے کام لیا گیا ہے - اور جو دعویٰ کیا گیا ہے اُس کے ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے - خلاصہ یہ ہے کہ کتاب پڑھنے والوں کے واسطے بلند مرتبہ حکیمانہ مطالب کا ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے جن کو کشادہ دلی سے پڑھ کر انسان زبان عربی کے کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اُس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عربوں کا دوسرے ملک کے باشندوں کو عجمی کہنا بیجا نہ تھا - اور یہی مصنف کا مقصد ہے - اب ہم ساتوں بابوں کے مباحث کی مختصر کیفیت پیش کرتے ہیں تاکہ اہلِ نظر "نمونے" سے اندازہ فرما سکیں کہ "خروار" میں کیا ہے۔

باب اول میں عربی زبان کے مخصوص فضائل ہیں - اُن میں سب سے اوّل وضع لغت کے معرکۃ الآرا مسائلے سے بحث کی ہے اور اس بارے میں جو مختلف اقوال ہیں اُن کو مفصل بیان کیا ہے - اُن کا خلاصہ چار قول ہیں - اول الہامی یعنی انسان اپنی گوناں گوں قابلیتوں کے ساتھ گویائی کی قابلیت بھی اپنے اندر لے کر اس عالم میں آیا - دوسرا قول - خارجی آوازوں سے متاثر ہو کر اُن سے الفاظ بنا لئے - خارجی آوازیں اور جانوروں کی تھیں - یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کس تاریخ سے ثابت ہے کہ اس خاکدان میں اول چرند و پرند آئے اُس کے بعد انسان - اس سے بھی زیادہ دقیق سوال یہ

ہو سکتا ہی کہ انسان الفاظ کے وضع کرنے میں فضائے عالم اور جانوروں کی آوازوں سے سبق حاصل کرنے کا محتاج تھا۔ اُن سے یہ سبق پڑھا۔ لیکن دوسرے گوناگوں کمالاتِ عالیہ کا خزانہ انسان کے دل و دماغ میں بھرا ہوا ہی۔ مثلاً فکر و تفکر کے بعد ترتیبِ مقدمات۔ اور ترتیب مقدمات کے بعد اخذ نتائج اور اخذ نتائج کے بعد اُن پر عمل۔ یہ تمام سبق انسان نے کس سے حاصل کیے۔ ظاہر ہی کہ اس کے سکھانے سے تو تمام ماحول عاجز و ساکت ہی۔ اس صورت میں ضرور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جہاں تمام کمالات کے خزانے فطرتِ انسانی میں ودیعت تھے وہاں کلام کا بھی کمال تھا۔

اسی ضمن میں ایک قول یہ بھی ہی کہ خود اپنی فطری آوازوں سے وضع الفاظ کا سبق سیکھا۔ مثلاً شدت کرب میں "تیخ"۔ درد میں "ہائے" "وائے"۔ خوشی میں "واہ"۔

تیسرا قول۔ عالم میں جو آواز بھی کہیں پیدا ہو وہ مختلف چیزوں کے باہم ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہی۔ انسان کی ادراک کرنے والی قوتوں نے جن مختلف خیالات سے ٹکریں کھائیں تو اُن ٹکروں سے باطنی آوازیں دماغ میں پیدا ہوئیں۔ آوازیں زبانوں تک آکر لفظ بن گئیں۔

عربی زبان کی خصوصیات کے تحت میں اوّل مخارج سے بحث کی ہی جو کلام کی سب سے پہلی منزل یا سیڑھی ہی۔ بدیہی طور پر ثابت کر دیا ہی کہ قدرت نے جس قدر مخرج انسان کے اندر حروف کے رکھے تھے اُن سے پورا پورا کام صرف عربوں نے لیا۔ غیر عرب ان میں سے اکثر کو غیر مستعمل چھوڑ کر ہاتھ سے کھو چکے۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک یوروپین عالم کو (جو عربی زبان کے امتحانوں میں کامیاب تھے) دعویٰ تھا کہ وہ عین اُس کے مخرج سے ادا کر سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے سے حلق کی جڑ کو دباتے تھے اُس کے بعد زور کر کے اُس مقام سے آواز نکالنے کی سخت کوشش کرتے تھے۔ چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا آنکھیں نکل آتی تھیں۔ مگر عین کی پوری آواز نہ نکلتی تھی۔ کچھ ضرور ادا ہو جاتی تھی۔ مخارج کے بعد حروف کے صفات بیان کیے ہیں۔ اس خصوصیت میں بھی عربی زبان صاف ممتاز ہو جاتی ہے۔

یہ نہ سمجھنا کہ مصنف نے یہ خصوصیات خود تراش لی ہیں جیسے اُن کے مقابل حریفوں کا عمل ہی۔ بلکہ ان قوانین پر بحث کی بنیاد رکھی ہی جو صدیوں کی تحقیق کے بعد ثابت اور مدوّن ہو چکے ہیں۔ اس بحث کے

مختلف پہلو پڑھنے اور پڑھ کر لطف اٹھانے کے قابل ہیں۔

دوسرے باب میں مخارج وصفات کی بحث کو اور زیادہ وسیع کیا ہی جس سے گویا وہ جدید بحث بن گئی ہی۔ اسی کے ساتھ اعراب سے بھی بحث کی ہی۔ اس باب میں دکھایا ہی کہ الفاظ میں حروف کی کمی بیشی یا حرکات کی خفت وشدت سے کس طرح اُن کے معانی میں مختلف مراتب خفت وشدت کے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس سے ثابت کیا ہی کہ عربی میں الفاظ کے اعراب اور حرکات کی وضع بھی ضابطہ وقانون سے خارج نہیں۔ بلکہ واضع نے اُن کو معانی کے تغیر وتبدل کا اسی طرح آلہ بنایا جس طرح اُن کی صورت کے تغیر وتبدل کا۔ جس طرح یہ بات بلحاظ اپنے مطالب کے پہلے باب سے زیادہ بلند اور دقیق ہو اُسی طرح اُس کی بحث اور اُس کا استدلال بھی زیادہ بلند پایہ ہی۔ اور یہ مؤلف علامہ کی تحریر کی خصوصیت ہی کہ جس قدر آیندہ ابواب میں دعوے بلند تر ہوتے گئے ہیں اُسی قدر اُن کی دلیل بلند و مضبوط ہوتی گئی ہے۔ اور مطالب کی دقت، بیان کی صفائی کی بدولت۔ فہم کے لئے مشکل نہیں بن جاتی بلکہ آسان اور سریع الفہم رہتی ہے۔

اول اور دوسرے باب میں مفرداتِ حروف کی بحث سے فارغ ہو کر تیسرے باب میں ترکیب حروف سے بحث کی ہی۔ اور یہاں بھی محض قیاسات سے نہیں دلائل سے ثابت کیا ہی کہ مختلف حروف کس طرح باہم مل کر اپنی مخصوص ترکیب سے اپنے معانی کا نشان دیتے ہیں۔ اور جس طرح علم کیمیا کا ایک ماہر ثابت کرتا ہی کہ کن صفات کی دو مختلف چیزیں باہم مل کر ایک خاص تیسری چیز پیدا کریں گی اسی طرح اس فن کا ماہر بتا دے گا کہ عربی میں جب فلاں صفات کے حروف سے لفظ بنے گا اُس میں فلاں معنی ہوں گے اگرچہ اُس نے لغت میں اُس لفظ کے معنی نہ دیکھے ہوں۔ اس بحث میں اول حروف کے صفات بتائے ہیں جو علم تجوید میں ثابت ہیں۔ اُس کے بعد دکھایا ہو کہ کس طرح اُن کے اجتماع سے اُن صفات کے مناسب معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حرف "جیم" اور "میم" اپنے صفاتِ مقررہ کے لحاظ سے جس لفظ میں مل جائیں گے اُس میں فراہمی اور اجتماع کے معنی پائے جائیں گے۔ جیسے "جم" بہت "جماعہ" گروہ "جمہور" گروہ کبیر۔ اس طرح بہت سے حروف کی صفات مقررہ بتا کر اُن کی کثیر مثالوں سے ثابت کیا ہی کہ حروف

کی صفات کا اثر معانی پر بطور قاعدہ کلیہ پڑتا ہے جن کو تھوڑی سی مناسبت زبانِ عربی سے ہو اُن کو ان مباحث میں وہی لطف آئے گا جو اقلیدس کی شکلیں حل کرنے میں حاصل ہوتا ہے۔

چوتھا باب جرجی زیدان کے اُس مغالطہ کا مدلل جواب دیتا ہے کہ زبانِ عربی کے الفاظ کا مادہ صرف دو حرف ہیں یعنی عربی کے تمام الفاظ "ثنائی" ہیں۔ تین یا چار حرف سے نہیں بنتے یعنی "ثلاثی" یا "رباعی" کوئی لفظ عربی میں نہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ بلا دلیل تھا مگر مصنف البیّن نے اس کی تردید بھی حکیمانہ پیرایہ میں کی ہے اور فلسفیانہ بحث سے ثابت کیا ہے کہ کیوں عربی لفظ کے مادّے کی تکمیل محض دو حرفوں سے نہیں ہوتی بلکہ ایک تیسرے اصلی حرف کے ملانے کی ضرورت ہے۔ اور تیسرے حرف کے ملنے کا معنی پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اس سلسلۂ بیان میں جرجی زیدان کی ہمہ دانی جس طرح بے نقاب ہو جاتی ہے ارباب فہم کے لئے عبرت افزا ہے جرجی زیدان کا لفظ "قط" کو "ثنائی" بتانا اُس کے علامۂ لغت ہونے کی ایسی روشن دلیل ہے جس کے خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہو سکتی۔ اس بحث میں "قطن" کے لفظ کی جس کے سامنے جرجی زیدان نے ہتھیار ڈال دیے تحقیق ایسی لطیف و نادر ہے کہ بہت سے برجستہ اشعار اُس پر قربان کئے جا سکتے ہیں "نون" کا اپنی صفت (غنّہ) کے ساتھ "قاف" اور "طا" سے مل کر "قطن" کی صورت پیدا کرنا اور اس مجموعہ کا اثر معنی میں یہ ظاہر کرنا کہ "روئی" نشو و نما کے بعد اندر سے اپنے گولڑ کو پھاڑ کر باہر آتی ہے۔ ایسی دقیق بحث ہے جس کی داد کا دنیا بہت مشکل ہے۔

پانچواں باب۔ اس میں ارتقائے لسان سے بحث فرمائی گئی ہے۔ اول مستشرقین کے مقرر کردہ اصولِ ارتقا تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اُس کے بعد ارتقا کو انسانی ارتقا سے عمرانیات کی مثال دے کر واضح کیا ہے۔ پھر یہ بیان کیا ہے کہ مستشرقین مذکور کے یہ اصول جدید نہیں بلکہ وہی ہیں جو صدہا برس پہلے ابو ہاشم معتزلی نے بیان کئے تھے۔ اس کے بعد بہت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ مسلکِ بالا پر بحث فرمائی ہے اور ثابت کیا ہے کہ مستشرقین کی یہ رائیں ایسے قیاسات ہیں جن کا ساتھ واقعات اور حقائق نہیں دیتے ان مباحث کے پڑھنے سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مؤلف کے دماغ کی بلند پروازی تحقیق اُس فضا تک جا پہنچی ہے جہاں مستشرقین کے قیاسات پست ہو کر رہ جاتے ہیں اور یہ امر قابل فخر ہے کہ جو مباحث دنیا

جدید تعلیم یافتہ طبع کو ساکت و مبہوت بنا دیتے ہیں ایک قدیم درس گاہ کا فیض یافتہ عالم نہ صرف یہ کہ اُن سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ قوتِ استدلال سے اُن کی کمزوریاں ظاہر فرما کر طالبانِ علم کو صحیح راستہ تحقیق کا دکھا دیتا ہے۔

چھٹا باب۔ فلسفہ اشتقاق پر ہے اور گویا جانِ سخن ہے۔ اس میں اشتقاق صغیر و کبیر کی تعریف کے بعد صغیر و کبیر کا فرق دکھایا ہے۔ اُس کے بعد اشتقاقِ کبیر سے مفصل بحث کی ہے۔ اشتقاقِ کبیر زبان عربی کی ایسی خصوصیاتِ عالیہ میں سے ہے جس کے سامنے تمام زبانیں سپر ڈال دیتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ صفت ایک زبان میں کیسے پیدا ہوئی۔ مؤلف علّام کا یہ کمال ہے کہ اس مسئلے میں جو تفصیل آج تک نہ ہوئی تھی وہ الہیین کے ذریعہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی اور پہلے لغت کے امام جس قاعدہ کو وضع کر کے اُس کی چند ہی مثالیں لکھ گئے تھے۔ مولانا نے اُس کی صدہا مثالیں لکھ دی ہیں۔ درس نظامی کی یہ بھی حیرت انگیز استعداد آفرینی ہے کہ اُس کے فیض یافتہ ہر مشکل پر غالب آ جاتے ہیں۔ صدہا مثالوں کے ذریعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ یہ عربی زبان کی خصوصی شان ہے کہ اُس کے الفاظ کی ترکیب کو چاہے جس طرح الٹو پلٹو نہ صرف یہ کہ وہ مہمل نہ ہوں گے بلکہ یہ کہ اپنے مخصوص معنی کو برابر قائم رکھیں گے۔ مثلاً ق م ر کی ترکیب سے جو لفظ بنے گا با معنی ہوگا اور اس میں بلحاظ ان حروف کی شخصی و ترکیبی صفات کے اُس کے معنی میں "بتدریج ظاہر ہونا" پایا جائے گا۔ مختلف ترکیبیں ملاحظہ ہوں۔ "قمر" چاند۔ (آہستہ آہستہ گھٹتا بڑھتا ہے) "رقم" لکھنا (ایک حرف کے بعد دوسرا اور ایک لفظ کے بعد دوسرا درجہ بدرجہ لکھا جاتا ہے)۔ "مرق" شوربہ مزا (شوربہ آہستہ آہستہ تیار ہوتا ہے) "قرم" سردار قوم (مرتبہ سرداری تک انسان بتدریج پہنچتا ہے) "رمق" تھوڑی سی جان جو باقی ہو (ایسی حالت میں سانس اور نبض دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں) "مقر" زہر قاتل (زہر کا اثر بتدریج ہوتا ہے) اس سے بڑھ کر لطافت "عسل" شہد۔ اس کا الٹا "لسع" ڈنک۔ شہد کی مکھی میں ایک طرف شہد ہے تو دوسری طرف ڈنک۔

اسی سلسلہ میں بعض الفاظ عربی جو عجمی الاصل خیال کر لیے گئے تھے۔ مثلاً "سراج" چراغ اور "لجام" لگام۔ اُن کا عربی الاصل ہونا اس قوتِ استدلال سے ثابت کیا ہے کہ بے اختیار تحسین زبان سے نکلتی ہے۔ اسی سلسلہ

میں یورپ کے مستشرقین کی رایوں کی کمزوریاں متعدد پیرایوں میں ظاہر فرمائی ہیں۔

ساتواں باب آخری باب ہے۔ اور اُس میں عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی دکھایا ہے۔ اس باب میں یہ بحث ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا صرف یہی کمال نہیں کہ وہ اپنے معنی کے ساتھ ایک نظم و تناسب رکھتا ہے۔ نہیں، بلکہ اُس کے معنی کو جب دقت و تعمق کی نظر سے دیکھا جائے تو اُس شے کی ایسی حقیقت سامنے آجاتی ہے جس کے اظہار کے لئے عجمیوں کو صدیاں درکار ہوئیں اور پھر بھی اُس کا بیان ایک لفظ سے نہ کر سکے۔ اور اس تعجب خیز دعوی کو متعدد مثالوں سے ثابت فرمایا ہے۔ ایک دوسرا پہلو وضع الفاظ کے کمال کا یہ دکھایا ہے کہ عرب اگر کسی مہمل آواز کی بھی نقل کرتے تھے تو وہ با معنی ہو جاتا تھا۔ اور ایسا با معنی جو اپنی اصل کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا تھا مثلاً کوے کے بولنے گھوڑے کی ٹاپ اور ہانڈی کے جوش کھانے کی آواز کی جب عربوں نے محاکات کی تو اس کی نقل کے لئے جو الفاظ وضع کئے اُن کے معنی اصل کے ساتھ مناسبت تام ملحوظ رکھی۔ مثلاً کوے کی آواز کی نقل عربی زبان میں "غاق غاق" ہے۔ چونکہ یہ نقل ایک سیاہ جانور کی آواز کی تھی اس لئے اس مادے سے جو الفاظ لیجئے اُن کے معنی میں سیاہی کا مفہوم موجود ہے۔ دیکھو۔ "تغیق بصرہ" (اس کی بینائی تاریک ہو گئی) "غیق فی رایہ" اس کو تیرہ رائے کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

خاتمۃ الباب میں "بے مثل مطالعہ صحیفہ کائنات" کی بحث ہے۔ عربوں نے دفتر کائنات کا مطالعہ جس عمیق نظر سے کر کے ہر ہر پہلو اور تعیین مدارج کو جدا جدا الفاظ کے ذریعہ سے بتایا اور دکھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ عرب لکھنے پڑھنے سے عام طور پر بے بہرہ تھے تاہم لکھنے پڑھنے کے سامان کی مختلف حیثیتوں کے لئے جس قدر الفاظ عربی زبان میں ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں۔ دیکھو جس "نے" سے قلم بنایا جاتا ہے جب تک اصلی حالت میں ہے "انبوبۃ" ہے۔ اب قلم تراشنا شروع ہوا جو ریزے کٹ کر گرتے گئے اُن کا نام "براء" یا "برایۃ"۔ قلم کے شگاف کو جس سے وسیع کرتے ہیں اُس کے لئے لفظ "لیطہ" نوک کاٹنے کو "قط" جس پر قط لگایا جائے وہ "مقط" جب بن کر درست ہو گیا تو اُس کا نام "قلم" ہوا۔ طرف قط کو "رشا" کہتے ہیں۔ قلم کی تعریف ہے "قلم رشاش" (محرف قلم) جب قلم چلا تو اُس کی آواز کا نام "صریر" ہے۔

اِسی طرح دوات اور روشنائی اور کتاب کے واسطے الفاظ ہیں ۔ اس دقت نظر او ریارہ یک بینی کو مولانا نے بہت سی مثالیں دے کر واضح اور مدلّل فرما دیا ہے۔ یہ بحث جس قدر نازک ہی اُسی قدر پرلطف اور خرد افروز ہی اسی پر کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

بیان بالا سے آپ کو واضح ہوا ہو گا کہ "المبین" نے عربی الفاظ کی پیدائش (مخارج) سے لے کر کمالِ عمر (کمالِ وضعِ الفاظ) تک کی ہر منزل سے بحث فرمائی ہے ؟ اور میرا یقین ہی کہ مدلّل بحث فرمائی ہے یہ کتاب اس قابل ہی کہ علم دوست احباب و اصحاب اِس کے مطالعہ سے لطف و بصیرت حاصل فرمائیں طلبا کو اُس کے مطالعہ کا موقع دیا جائے تاکہ وہ بھی تحقیق اور آزادانہ تحقیقات کے انداز سیکھیں، اُس کے خوگر ہوں۔ علما اُس کو مطالعہ فرما کر تحقیقات کا قدم اور آگے بڑھائیں۔ کاش اس رسالے کا ترجمہ عربی اور کسی یوروپین زبان میں ہوتا تاکہ دوسرے ممالک کے اہلِ کمال بھی مؤلف علّام کی محنت و تحقیق کی داد دے سکتے۔ **فقط**[1] خود مولانا مرحوم نے اس کا عربی ترجمہ ایک صاحب معروف بہ "شامی صاحب" سے کرایا تھا جو "المبین" کی تالیف و اشاعت کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے معلم تھے اور اس خدمت کے معاوضہ میں شامی صاحب کی کتاب "تعلیم العربیۃ" باہتمام بندہ اپنے صرف سے چھپوا دی تھی اور ان کا ارادہ یہ ترجمہ بھی چھپوانے کا تھا مگر حالات نے مساعدت نہ کی اور مسودہ غالباً ان کے متروکہ سامان کے ساتھ ان کے ورثا کے قبضہ میں گیا۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

صحیح بخاری کا ایک عتیق نسخہ

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

شہر ربیع الاول سنہ حال (۱۳۴۹) کے معارف میں کتاب خانہ ریاست رام پور کے صحیح مسلم کے نسخہ عتیق کا ذکر ہے۔ "الشئی بالشئی یذکر" میرے کتاب خانہ میں ایک نسخہ صحیح بخاری کا عتیق ہے جلد اول یہ نسخہ بخط عرب سمرقندی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ سطر فی صفحہ ۲۱۔ لوح پر شمسہ طلائی و لاجوردی ہے۔ اُس میں یہ عبارت بخط نسخ شنجرفی جلی خوشخط درج ہے "جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی است جلد سیاہ و ترنج سرخ و جدول طلا و بستہ بابتہ فتح شہر محمد آباد المعروف

بے واسطہ گوش و لب ز راہ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

حیدرآباد (دکن) ۲۳ محرم الحرام ۱۳۴۳ھ

محمد حبیب الرحمن

گزارش

(متعلق کتاب الحج مؤلفہ مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب بہاری صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی)

حسب ارشاد نبوی اسلام جن پانچ ستونوں پر قائم ہی اُن میں سے ایک حج بھی ہی۔ اُس کے ادا کرنے کے بڑے بڑے فضائل ہیں نہ کرنے پر نہایت شدید وعید۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ یہ فرض ادا کرنا ہوتا ہی۔ اس سے واضح ہو گا کہ حج کا سفر کس قدر مہتم بالشان سفر ہی۔ خدانخواستہ اگر اس سفر میں آداب و فرائض کا اہتمام نہ ہوا تو گویا ساری عمر کی محنت برباد ہوئی، ثواب واجر سے محرومی جداگانہ اس کے علاوہ دوسرے فرائض مثلاً نماز و روزہ ایسے ہیں کہ انسان اُن کو دوسروں کو ادا کرتے دیکھتا رہتا ہی۔ مع ہذا چونکہ نماز ہر روز ادا ہوتی ہی روزے ہر سال آتے ہیں اس لئے اُن کے مسائل بھی بہت کچھ علم و عمل میں ہیں۔ ایک ان فرائض کے ادا کرنے میں یہ سہولت بھی ہی کہ گھر پر ادا ہوتے ہیں۔ برخلاف حج کے کہ وہ عمر میں اکثر ایک ہی مرتبہ ادا کیا جاتا ہی۔ اس لئے اُس کے مسائل کا چرچا اور علم بہت کم ہوتا ہی۔ اس بے علمی کے ساتھ سفر کی صعوبت اور مصروفی ایسی ہوتی ہی کہ مسئلہ معلوم بھی ہو تو اس کا ذہن میں رہنا اور اُس پر عمل ہونا آسان نہیں۔

سفر کا تجربہ بتاتا ہی کہ بہت کم لوگ ضروری مسائل سے واقف ہوتے ہیں۔ جو لوگ لکھے پڑھے نہیں وہ ایک طرف اچھے لکھے پڑھے بھی ضروری مسائل سے واقف نہیں ہوتے۔ حرمین محترمین میں پہونچ کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پڑجاتے ہیں جو اکثر بے علم اور اس لئے صحیح مسائل سے کم واقف

ہوتے ہیں۔ حجاج اپنے آپ کو اُن کی سپرد کر دیتے ہیں اور جو وہ بتاتے جاتے ہیں اُس پر عمل کرتے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے عام فہم رسالوں کی شدید ضرورت ہے جن میں ضروری مسائل حج و زیارت بیان کئے گئے ہوں۔ علمائے کرام نے وقتاً فوقتاً اس جانب توجہ فرمائی ہے۔ میرے ساتھ سفرِ حج میں ایک سے زیادہ ایسے رسالے تھے۔ فقہ کی کتابیں بھی تھیں۔ تاہم تجربہ ہوا کہ مسائل کا اُن رسالوں سے اور کتابوں سے عین وقت پر معلوم ہونا آسان نہیں۔ عموماً رسالوں میں مسائل حج متفرق طور پر لکھ دیئے گئے ہیں۔ عبارت کی صفائی و شگفتگی پر کم لحاظ کیا گیا ہے۔ مع ہذا اُن کے بیان میں وہ ذوق نہیں جو سفرِ حج کا رکن اعظم ہے۔ پس ان رسالوں اور کتابوں کے ہوتے ہوئے بھی ایسے رسالے کی ضرورت تھی جو شگفتہ و پاکیزہ، ذوق آفریں، شوق افزا بیان و عبارت میں ترتیب و تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہو۔ اور ترتیب ایسی ہو کہ ہر موقع کا مسئلہ وقت پر بہ آسانی مل سکے۔ میرے سفرِ حج کے وقت محبی فی اللہ فضائل پناہ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے غایت کرم سے رسالۂ ہذا کا مسودہ بطور زادِ راہ میرے ساتھ کر دیا تھا۔ میں نے اُس کو حرزِ بازو بنایا اور برابر زیرِ مطالعہ رکھا۔ میں صاف اقرار کرتا ہوں کہ یہ رسالہ ساتھ نہ ہوتا تو بہت سے مسائل معلوم ہی نہ ہوتے یا دقت سے ملتے اور یہ دقت سفر کی دقتوں میں ایک اور دقت کا اضافہ کرتی۔ آسانی اس سے سمجھو کہ بعض دوسرے رسالوں میں دعائیں ایسی ایسی طویل تھیں کہ اُن کا یاد کرنا اور پڑھنا دشوار بلکہ بعض وقت شاید غیر ممکن ہوتا مثلاً طواف کی دعائیں کہ ایک طواف میں متعدد دعائیں پڑھنی ہوتی ہیں اور مختصر دعاؤں کی گنجائش بھی اس وقت میں دقت سے نکلتی ہے۔ بہرحال اس رسالے نے مجھ کو بہت کچھ بصیرت اور سہولت بخشی۔ اللہ تعالیٰ مؤلف عالی مرتبہ کو جزائے خیر بخشے۔ اُس وقت تک یہ رسالہ صرف مسائل حج تک مرتب ہوا تھا۔ زیارت مدینہ طیبہ کے مسائل قلمبند نہ ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے حضرت شیخ دہلوی قدس سرہٗ کی کتاب جذب القلوب سے استفادہ کیا۔ اب مولانا نے مسائل زیارت شریف کو بھی اضافہ فرما کر رسالہ مکمل فرما دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حرمین محترمین کے ضروری حالات، قابلِ زیارت مقامات کی تفصیل بھی درج فرما دی ہے تاکہ مزید بصیرت

وتعلق حاصل ہو۔

ابھی آپ دیکھیں گے کہ غیر ضروری مسائل درج نہیں کئے۔ ضروری مسائل مرتب ابواب اور نہایت سلیس وصاف بیان میں ایسے دل کش اور شوق آفریں انداز سے تحریر فرمائے گئے ہیں کہ ہر موقع کا مسئلہ فوراً نکل آئے گا۔ پڑھنے پر بے دقت سمجھ میں آجائے گا۔ اسی کے ساتھ دل میں ایک کیفیت شوق و نیاز پیدا کر دے گا۔ اب اس کے آگے اللہ کا نام اور اُس کا فضل اور اُس کے حبیب پاک کا کرم درکار رہی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب عاجز بندہ شوق سے ادائے ارکان وآداب کرے گا فضل وکرم کی اُمید واثق ہی۔

مسائل کی صحت کا پورا اطمینان اس سے ہو سکتا ہی کہ مستند فقہ کی کتابوں کی اصل عبارتیں حوالہ کے ساتھ درج فرما دی گئی ہیں۔ ان عبارتوں کا اور دعاؤں کا سلیس ترجمہ بھی فرما دیا ہے۔ دعاؤں کا ترجمہ اُن کے اثر و نیاز میں مددگار ہو گا۔

اے عازمانِ حج' مولنا اپنا فرض ادا فرما چکے اب تمہارا کام ہی کہ عمل کی کوشش کرو اور دارین کی فلاح حاصل۔ [1]

اللہ تعالیٰ یہ سعی مشکور فرمائے۔ حضرت مؤلف کو جزائے خیر بخشے اور جس ذات گرامی نے عامۂ مسلمین کی حج کی مقبولی کی فکر فرمائی ہی اُس کا اور اُس کے رفقاء کا سفر حج (جو اس سال مع الخیر والعافیہ انشاء اللہ تعالیٰ ہونے والا ہے) مقبول و مبرور رہو۔ آمین یا رب العالمین بجاہ حبیبک سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

حبیب گنج:
۲۰ر رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ

نیازمند
جبیب الرحمن خاں (صدر یار جنگ)

---

[1] یہ کتاب نہایت عمدہ اور صحیح چھپی ہوئی مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔